

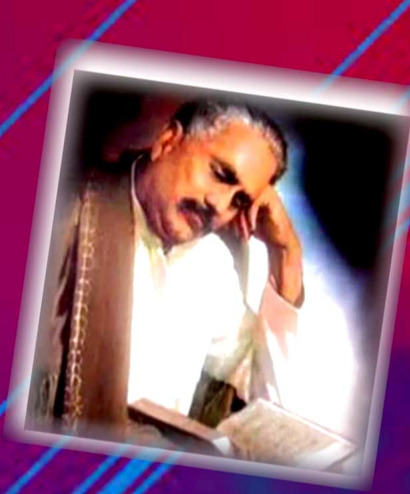
ALFALAH  
MAGZINE



ماہنامہ  
الفلاح

March 2021

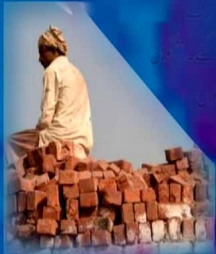
مارچ ۲۰۲۱



ناامیدی موت ہے



ماسٹر گل نوخیز اختر  
غصاؤں غصاؤں



ڈاکٹر وکٹر فرینکل کی کتاب  
"Man's search for meaning"  
کے اردو ایڈیشن "امید زندگی ہے" سے اقتباس  
شامل کیا گیا ہے۔





03 نا امیدی موت ہے۔

04 بھرا گلاس، خالی گلاس

05 ماسٹر غاؤں غاؤں

08 علامہ اقبال (شاعری)

08 واصف علی واصف (اقوال)

معاون خصوصی: احسان اللہ کیانی

Ehsanullahkiyani.com

مدیر: عثمان علی

رسالہ فی سبیل اللہ حاصل کرنے  
لیے درج ذیل نمبر پر میج کریں۔

0307-0559827

join us on

Facebook:



www.facebook.com/  
Alfalahyouthforum

join us on

YouTube:



Alfalah Youth Forum

join us on

Whatsapp:



[ Name Join Alfalah ] SMS to  
0302-7396939

(for example)

[ Usman Join Alfalah ] SMS to 0302-7396939

That's the thing  
about books.  
They let you  
travel without  
moving your feet.



وہ ایک ماہر نفسیات تھا۔ اپنے خاندان کے ساتھ خوشحال زندگی بسر کر رہا تھا۔ لیکن پھر اچانک کچھ ایسا ہوا، جو کبھی کسی نے سوچا تک نہ تھا۔ اسے والدین، بھائیوں اور بیوی سمیت گرفتار کر لیا گیا۔ اس پر غضب یہ کہ سب کو مختلف جگہوں پر قید کر دیا گیا۔

اس کا باپ تشدد برداشت نہ کر سکا اور پہلے چھ ماہ میں ہی اس دنیا کو خیر آباد کہہ گیا۔ لیکن یہ جوان تھا مار پیٹ برداشت کرتا رہا اور بطور ماہر نفسیات اپنے ساتھ موجود قیدیوں کو پُر امید رکھنے کی کوشش کرتا کیونکہ وہ جانتا تھا امید ہی زندگی ہے۔ اُس کا سب سے اہم اور امید افزا جملہ تھا کہ:

**" آدمی سے سب کچھ چھینا جا سکتا ہے، لیکن اس کی آزادی نہیں چھینی جا سکتی... یعنی کسی بھی قسم کے حالات میں وہ کس قسم کا رویہ منتخب کرے گا، کون سا طریقہ اختیار کرے گا۔"**

اپنے گھر میں ایئر کنڈیشنر کمرے بیٹھ کر اگر کوئی یہ جملہ کہتا تو شاید لوگ اسے اہمیت نہ دیتے لیکن وہ اس حالت میں نہیں بلکہ کچھ مختلف حالات میں یہ جملہ کہہ رہا تھا۔ وہ قیدی تھا اس کی قید بھی کچھ عجیب سی تھی قیدی اگر کام نہ کر سکتا تو اس کا ایک ہی حل تھا اور وہ تھا: **"کھولتا ہوا"**

تو وہ اپنے مقصد کے مطابق بطور ماہر نفسیات سائنسی تحقیقات کر رہا تھا کہ لوگ مختلف حالات میں کیا رد عمل پیش کرتے ہیں۔ اس مقصد نے اسے پُر امید رکھا اور اس امید نے اسے زندہ رکھا کہ آزاد ہونے کے بعد وہ لوگوں کو اس فلسفے سے روشناس کرائے گا۔

اس قید میں موجود ایک شخص صرف اس وجہ سے زندہ رہا کہ وہ آزاد ہو کر اپنے بیٹے سے ملے گا جس سے وہ بہت محبت کرتا ہے۔

ایک اور شخص اس مقصد کے لیے زندہ تھا کہ اس نے سائنسی تحقیقات پر مبنی کتابیں

لکھی جو ابھی مکمل نہیں ہوئی تھی وہ یہ سوچتا تھا کہ اس نے جو کام کیا ہے وہ کوئی اور نہیں کر سکتا ہے۔

قید کے دوران خودکشی بھی بہت سے لوگوں نے کی، ان سب میں ایک بات مشترک تھی "اب زندگی میں اور بچا ہی کیا ہے جس سے امید رکھی جائے۔"

امید ختم ہوتی ہے تو انسان اپنی زندگی ختم کر دیتا ہے اور امید پیدا ہوتی ہے مقصد سے، اگر زندگی کا مقصد نہ ہو تو انسان ناامید اور مایوس ہو جاتا ہے اس کی اپنی زندگی تو مشکل ہوتی ہی ہے ایسا شخص اپنے ساتھ جڑے لوگوں کے لیے بھی تکلیف کا باعث ہوتا ہے، لہذا اپنی زندگی کو بامقصد بنائیں پُر امید رہیں۔

زندگی بہت ہی حسین سفر ہے۔ (جاری ہے)

## ناامیدی موت ہے



عثمان علی

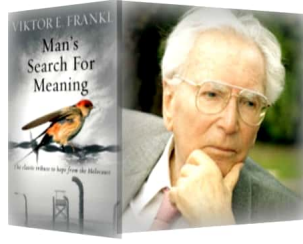
تیل "جی آپ بلکل ٹھیک سمجھے اسے مار دیا

جاتا۔ اس لیے موت سے بچنے کے لیے ہر کوئی مسلسل کام کرتا۔

اس قید خانے کے حالات بہت ہی بیانک تھے، ایک دن کا احوال ماہر نفسیات کی اپنی زبانی "میں اس وقت درد سے رو رہا تھا، کیوں کہ پھٹے ہوئے جوتے پہننے کی وجہ سے میرے پیروں میں پھوڑے نکل آئے تھے۔ ایسی حالت کے ساتھ میں اپنے کیمپ سے کام کی جگہ تک چند کلو میٹر تک لنگھتا ہوا چلا۔ سخت ٹھنڈ تھی۔ تیز ہوا تھپڑے مار رہی تھی۔ میں اس پر مشقت زندگی کے نہ ختم ہونے والے چھوٹے چھوٹے مسائل کے بارے میں سوچ رہا تھا۔"

ان سب مشکلات کے باوجود ماہر نفسیات نے اپنے آپ کو پُر امید رکھنے کے لیے ایک طریقہ کار وضع کیا جسے لوگوں کو تھیراپی کا نام دیا۔ لوگوں کو تھیراپی میں انسان کو اپنی زندگی کو ایک مفہوم دینا ہوتا ہے ایک مقصد تلاش کرنا ہوتا، وہ جب ان مشکلات سے دوچار ہو رہا تھا

بلاخر سیاہ رات کا اندھیرا ڈھلا اور وہ روشن سورج طلوع ہوا جس کا لوگ برسوں سے انتظار کر رہے تھے۔ ماہر نفسیات کی امید پوری ہو گئی کھلی آنکھوں سے دیکھے خواب پورے ہو گئے اور پھر ایک دن آیا کہ وہ سیٹج پر کھڑا تھا اور لوگوں کو اپنے سائنسی مشاہدات سے آگاہ کر رہا تھا۔ یہی وہ خواب جس نے انتہائی سخت حالات میں بھی اسے پر امید رکھا۔



ڈاکٹر وکٹر فرینکل کی کتاب  
"Man's search for meaning"  
کے اردو ایڈیشن "امید زندگی ہے" سے اقتباس  
شامل کیا گیا ہے۔

یہ کہانی ہے ڈاکٹر وکٹر فرینکل کی  
جسنبہوں نے دوسری جنگ عظیم کے دوران  
نازی جبرمنوں کے ڈیٹھ کیمپ میں تین برس  
گزارے۔

اگر کسی میز پر ایک گلاس پانی سے آدھا بھرا ہوا رکھا ہو تو اس بات کو دیکھنے، سمجھنے اور بیان کرنے کے دو پیرائے ہیں۔ ایک یہ کہ گلاس آدھا خالی ہے اور دوسرا یہ کہ گلاس آدھا بھرا ہوا ہے۔ دونوں صورتوں میں بظاہر فرق کچھ نہیں پڑتا لیکن درحقیقت یہ دو قسم کے انداز فکر کی نمائندگی کرتے ہیں۔ ایک منفی اور دوسرا مثبت۔

منفی اور مثبت انداز فکر کیا ہوتا ہے اس کو ایک واقعے سے سمجھیے جو کچھ عرصہ قبل ایک صاحب نے مجھے سنایا۔ وہ ایک روز کسی نشست میں بیٹھے ہوئے تھے۔ بات چلی تو ذکر پاکستان چھوڑ کر باہر جانے والے نوجوانوں کا ہونے لگا۔ اس نشست میں موجود ایک صاحب نے اس پوری صورتحال کی ایک اندوہناک تصویر کھینچنا شروع کر دی۔ انہوں نے بتایا کہ کس طرح ہزاروں کی تعداد میں پڑھے لکھے، اعلیٰ تعلیم یافتہ اور ہنرمند نوجوان ملک چھوڑ چھوڑ کر جارہے ہیں اور اس طرح جو برین ڈرین (Brain Drain) ہو رہا ہے اس کے نتیجے میں کچھ عرصے میں ملک بنجر ہو جائے گا۔

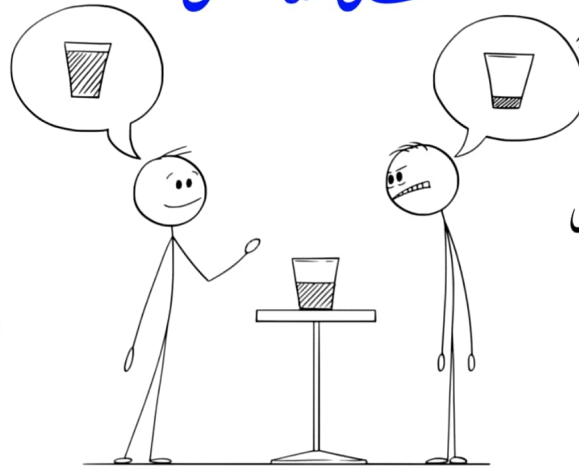
اس بیان سے اس نشست میں مایوسی کی ایک فضا چھا گئی۔ ایسے میں میرے جاننے والے صاحب نے گفتگو میں مداخلت کی اور صورتحال کا ایک بالکل مختلف رخ دکھایا۔ انہوں نے کہا کہ پڑھے لکھے نوجوان ملک سے باہر جارہے ہیں، یہ ایک ناقابل تردید حقیقت ہے۔

ابو یحییٰ

حقیقت یہ ہے کہ یہی باہر جانے والے  
پاکستانی ہیں جن کی وجہ سے ہمارا ملک  
بدترین حالات کے باوجود دیوالیہ ہونے  
سے بچا ہوا ہے۔

بھرا گلاس  
خالی گلاس

اس کی وجہ یہ ہے کہ باہر  
جانے والوں کا خاندان پاکستان  
ہی میں رہتا ہے۔ یہ لوگ ہر  
برس اربوں ڈالر کی فارن کرنسی  
وطن میں اپنے لوگوں کو بھیجتے  
ہیں۔ (جاری ہے)



انہوں نے اسی روز اخبار میں  
شائع ہونے والی ایک خبر کا حوالہ دیتے  
ہوئے کہا کہ برطانوی حکومت کی تمام  
تر سخت ویزا پالیسیوں کے باوجود پچھلے  
برس ہزاروں پاکستانی طالب علم برطانیہ  
گئے۔ جبکہ جانے والوں کی ایک بڑی  
تعداد برطانوی شہریت بھی لے لیتی  
ہے۔ ان صاحب نے عرض کیا کہ یہی  
معاملہ دیگر ممالک جانے والے پاکستانی  
نوجوانوں کا ہے۔ مگر یہ تصویر کا ایک  
رخ ہے۔

گل نوخیز اختر

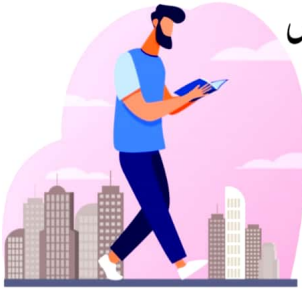
ماسٹر

## غناؤں غناؤں

بچپن میں سنتے تھے کہ زیادہ علم حاصل کرنے سے انسان پاگل ہو جاتا ہے۔ بہت دفعہ سوچا کہ علم انسان کو پاگل کیسے کر سکتا ہے؟ لیکن اب میں یقین سے کہہ سکتا

ہوں کہ واقعی ایسا ہوتا ہے۔ میں نے اس کا عملی مظاہرہ دیکھا ہے۔ اکثر گھر میں بذریعہ ڈاک کتابیں موصول ہوتی ہیں اور جس وقت پوسٹ مین آتا ہے عین اُسی وقت میرا مالی جیرا بھی پودوں کی تراش خراش میں مصروف ہوتا ہے لہذا کتابیں وہی وصول کرتا ہے۔ میرے صحن میں

لیموں کا ایک پودا ہے جو ہر موسم میں لیموں دیتا ہے۔ اُس روز میں کچھ لیموں توڑ رہا تھا کہ مین گیٹ کی بیل



ہوئی۔ جیرا مالی پودوں کو پانی دے رہا تھا۔ اُس نے پانی کا نل بند کیا اور گیٹ سے باہر چلا گیا۔ تھوڑی دیر بعد وہ واپس آیا تو اُس کے ہاتھ میں ایک بنڈل تھا جس کی پیکنگ بتا رہی تھی کہ اندر کتابیں ہیں۔ میں نے وہیں پیکٹ کھولا اور کتابوں کو الٹ پلٹ کر دیکھنے لگا۔ جیرا مالی میرے قریب ہوا اور آہستہ سے بولا ”صاحب! زیادہ کتابیں پڑھنے سے علم کی تاپ چڑھ جاتی ہے۔“ میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا اور مسکرایا ”یہ سب خیالی باتیں ہیں چاچا، علم کی وجہ سے ایسا نہیں ہوتا۔“

ہر برس اس رقم میں اضافہ ہوتا جا رہا ہے اور اسی رقم کی وجہ سے پاکستان کا تجارتی خسارہ ایک حد ہی میں رہتا ہے۔ دوسری طرف پاکستان کو اس صورتحال کا نقصان اس لیے نہیں ہوتا کہ ہمارے ملک کی غالب ترین اکثریت نوجوانوں پر مشتمل ہے۔ اس لیے جتنا بھی برین ڈرین ہو جائے قابل لوگ پھر بھی موجود رہتے ہیں۔ بلکہ جانے والوں کی جگہ لینے کے لیے فوراً دوسرے لوگ آ جاتے ہیں۔ ایسا نہیں ہوتا کہ ملک کو کسی شعبے میں قابل لوگوں کی کمی کا سامنا ہوا ہو بلکہ جانے والوں کی وجہ سے بے روزگاروں کو روزگار بھی مل جاتا ہے۔ اس طرح ملک کو ہر دو پہلو سے فائدہ ہی ہو رہا ہے۔

تیسرا اور ایک بڑا اہم فائدہ جو اس معاشی ہجرت کا نکلتا ہے کہ باہر جانے والے اپنے مذہب سے اور گہرے طور پر وابستہ ہو جاتے ہیں۔ وہ ملک کے اندر رہتے ہوئے اچھے مسلمان نہیں ہوتے لیکن ان کی ایک بڑی تعداد ملک سے باہر جا کر نیکی کی زندگی اختیار کر لیتی ہے۔ ایسے لوگ اسلام کا چلتا پھرتا تعارف بن جاتے ہیں۔ ان میں سے بہت سے غیر مسلم خواتین کو مسلمان کر کے ان سے شادی بھی کر لیتے ہیں۔ یوں اسلام کی دعوت غیر مسلموں میں ان لوگوں کی وجہ سے تیزی سے پھیل رہی ہے۔ اس طرح یہ ہجرت بالواسطہ طور پر دین کی نصرت کا بھی سبب بن رہی ہے۔

یہ واقعہ بتاتا ہے کہ ہر معاملے کو دیکھنے کا منفی اور مثبت دونوں طرح کا طریقہ ہوتا ہے۔ جن لوگوں کا انداز فکر منفی ہوتا ہے وہ صرف منفی رخ سے چیزوں کو دیکھتے اور مایوسی پھیلاتے ہیں۔ جبکہ مثبت ذہن کے لوگ ہر چیز میں خیر تلاش کر لیتے ہیں۔ وہ خود بھی روشنی دیکھتے ہیں اور دوسروں کو بھی دکھاتے ہیں۔ یوں لوگ اور ان کی امید ہمیشہ زندہ رہتی ہے۔ یہی وہ انداز فکر ہے جس کی آج ہمیں اشد ضرورت ہے۔

ایک لحاظ سے دیکھا جائے تو Brain Drain والی بات بھی درست ہے۔







یہ سنتے ہی جیرے مالی نے کندھے پر پڑا اپنا کپڑا اتار کر پسینہ پونچھا اور غور سے میری طرف دیکھا ”صاحب جی! ہمارے گاؤں میں ایک ایسا بندہ موجود ہے۔“ میرے کان کھڑے ہو گئے۔ ”کون ہے وہ؟“۔ جیرے مالی نے دانت نکالے ”ماسٹر غاؤں غاؤں“۔۔۔ پتا چلا کہ جیرے کے گاؤں میں گذشتہ پچاس سالوں میں ایک ہی شخص پڑھا لکھا ہے اور وہ بھی پاگل ہو چکا ہے۔ شہر کے کسی سکول میں ہیڈ ماسٹر تھا، پھر واپس گاؤں چلا آیا اور اب ہاتھ میں اینٹ اٹھائے غاؤں غاؤں کرتا پھرتا ہے۔

جیرے مالی کا گاؤں دور دراز کے کسی علاقے میں تھا لیکن مجھ پر تجسس کا بھوت سوار ہو چکا تھا۔ میں نے پوچھا کہ ”چاچا کیا میں تمہارے گاؤں جاکر اُس ماسٹر کو دیکھ سکتا ہوں؟“۔ جیرے نے کندھے اچکائے ”جب مرضی دیکھ لیں، لیکن ہمارے گاؤں کا راستہ بڑا خراب ہے، گاڑی نہیں جائے گی۔“ میں جلدی سے بولا ”ٹرین یا بس تو جاتی ہوگی؟“۔ اُس نے اثبات میں سر ہلایا ”صرف بس جاتی ہے لیکن دو بسیں بدلنا پڑتی ہیں۔“

میں نے جیرے سے اُس کے گاؤں کا ایڈریس لیا، حوالے کے لیے ایک نام معلوم کیا اور روانہ ہو گیا۔ تین گھنٹے کے طویل سفر کے بعد گاؤں پہنچا تو شام ہو چکی تھی۔ راستہ واقعی خراب تھا، پورا انجر پنجر ہل گیا۔ سخت تھکن ہو رہی تھی لہذا گاؤں میں داخل ہوتے ہی چاچے جیرے کے بتائے ہوئے بندے کا پوچھا اور وہاں پہنچ گیا۔



یہ بندہ چاچے جیرے کا بہنوئی ”نہلا“ تھا اور گاؤں میں کافی اثر و رسوخ رکھتا تھا۔ بڑی محبت سے ملا اور بیٹھک میں خاص طور پر میرے لیے بستر لگوا دیا۔ رات کے کھانے میں اُس سے گفتگو ہوئی تو میں نے جان بوجھ کر ماسٹر غاؤں غاؤں کا ذکر چھیڑ دیا۔ نہلے نے قہقہہ لگایا ”وہ تو جی پاگل ہے، اینٹ دے مارے گا۔“ میں نے لسی کا ایک گھونٹ بھرا ”کیا وہ کسی کو بھی دیکھتے ہی اینٹ مار دیتا ہے؟“۔ نہلے نے نفی میں سر ہلایا ”نہیں! ویسے تو باتیں کرتے رہیں تو لگتا ہی نہیں کہ پاگل ہے، لیکن بحث تھوڑی لمبی ہو جائے تو اچانک اینٹ اٹھا لیتا ہے۔“

میں نے سر کھجایا، اگر واقعی ایسا تھا تو ماسٹر غاؤں غاؤں سے ملنا بہت ضروری تھا، میں جاننا چاہتا تھا کہ علم نے اُسے کیسے پاگل کیا۔ نہلے سے طے پایا کہ صبح وہ گاؤں والوں کے ساتھ مجھے ماسٹر سے ملوانے لے جائے گا۔ اگلے دن ناشتے کے بعد سارے گاؤں والے اکٹھے ہو گئے۔ اُن کے چہروں پر ایسی خوشی تھی گویا کسی میلے میں جارہے ہوں۔ میں نے نہلے سے پوچھا کہ یہ لوگ ساتھ کیوں جارہے ہیں؟ نہلے نے قہقہہ لگایا ”بس جی! شغل میلے کے شوقین ہیں، ویسے بھی یہ لوگ ماسٹر کے دماغ کو زیادہ سمجھتے ہیں، یہی ماسٹر سے بات چیت کریں گے، آپ نے بس پیچھے رہ کر دیکھنا ہے کہ ماسٹر کیسے پہلے پاگلوں والی باتیں کرتا ہے اور پھر اینٹ اٹھاتا ہے۔“



میں نے ایک اہم سوال کیا ”کیا ماسٹر صاحب کے گھر والے بھی ساتھ رہتے ہیں؟“۔ نہلا ہنس پڑا ”نہیں! وہ شہر میں ہیں، صرف ماسٹر ہی تماشاً لگانے کے لیے یہاں رہ گیا ہے۔“ دس منٹ بعد ہم سب ماسٹر غاؤں غاؤں کی رہائش گاہ کے قریب پہنچ گئے۔ اُن کے گھر کے باہر شیشم کا ایک درخت لگا ہوا تھا۔ میں نے دور سے دیکھا کہ گھنی چھاؤں میں ایک ساٹھ پینسٹھ سالہ عمر رسیدہ شخص کرسی پر بیٹھا، عینک لگائے کوئی کتاب پڑھ رہا ہے۔ گاؤں کے سب لوگوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور پھر محتاط انداز میں آگے بڑھنے لگے۔

نہلے نے میرا ہاتھ پکڑ کر وہیں روک لیا۔ گاؤں والے ماسٹر کے تھوڑا اور پاس آگئے۔ شائد ماسٹر کو بھی لوگوں کی آمد محسوس ہوگئی تھی۔ اُس نے یکدم کتاب سے نظریں اٹھائیں اور لوگوں کی طرف دیکھا۔ کچھ دیر تک وہ اُنہیں گھورتا رہا، پھر اچانک اُس کے لبوں پر مسکراہٹ نمودار ہوئی ”آؤ آؤ۔۔۔ کیا پوچھنے آئے ہو؟“۔ مجمع میں سے ایک ہٹا کٹا نوجوان دو قدم آگے بڑھا ”ماسٹر صاحب! وہ پوچھنا تھا کہ چڑیل کو کیسے پکڑا جائے؟“۔ ماسٹر نے کچھ لمحے بات سنی، پھر تیوری چٹھائی ”کون سی چڑیل، کیسی چڑیل، کوئی چڑیل وڑیل نہیں ہوتی۔“ گاؤں والوں کی دبی دبی ہنسی نکل گئی۔ وہی نوجوان پھر بولا ”لیکن ماسٹر صاحب! جو بھی رات کو قبرستان والے راستے میں بوہڑ کے درخت کے نیچے سوتا ہے مر جاتا ہے، گاؤں کے تین لوگ مارے جاچکے ہیں۔“ ماسٹر نے کتاب بند کی اور بڑے پیار سے بولا ”دیکھو! یہ تو پرائمری کا بچہ بھی بتا سکتا ہے کہ درخت دن کو آکسیجن اور رات کو کاربن ڈائی آکسائیڈ خارج کرتے ہیں اسی وجہ سے رات کو کسی بھی درخت کے نیچے سونے سے آکسیجن کی کمی ہو جاتی ہے اور سونے والے کی موت ہو جاتی ہے، اس میں کسی چڑیل کا کوئی ہاتھ نہیں۔“ یہ سنتے ہی ساری فضا قہقہوں سے گونج اٹھی۔

نہلے نے فخریہ انداز میں میری طرف دیکھا ”دیکھا! کردی ناں پاگلوں والی بات۔“ میں نے ماسٹر کی طرف دیکھا جو لوگوں کے قہقہے سن کر دانت پیس رہا تھا۔ گاؤں کا رنگ ریز آگے بڑھا ”ماسٹر صاحب! کالا رنگ کیسے بنتا ہے؟“۔ ماسٹر نے گردن اُس کی طرف گھمائی ”بھئی کالا رنگ کوئی رنگ نہیں ہوتا۔ یوں سمجھ لو جس چیز میں کسی رنگ کی ملاوٹ نہ ہو، یعنی بے رنگ ہو وہ کالی ہوتی ہے۔“

سب لوگ ہنستے ہوئے لوٹ پوٹ ہو گئے۔۔۔ سوال کرنے والے نے بلند آواز کہا ”اوئے پاگل ماسٹر! میرے بال سفید ہیں، میں ہر چوتھے دن خضاب لگاتا ہوں پھر یہ سفید سے کالے کیسے ہو جاتے ہیں؟“ قہقہے بلند ہو گئے۔ ماسٹر ایک دم کھڑا ہو گیا۔ سب لوگ چوکنے ہو گئے۔ ایک اور سوال آیا ”ماسٹر صاحب! چاند پر کھڑے ہو کر زمین پر پتھر پھینکا جائے تو کتنی دیر بعد نیچے گرتا ہے؟“۔ ماسٹر کے لہجے میں بے بسی اُٹ آئی ”دیکھو! چاند اوپر نہیں، زمین کے سامنے ہے، اس لیے چاند پر کھڑے ہو کر زمین نیچے نہیں اوپر نظر آئے گی۔“ سب کی بتسیاں نکل آئیں۔ یوں لگا جیسے پورے مجمع کو کسی نے مشترکہ گدگدی کی ہو۔

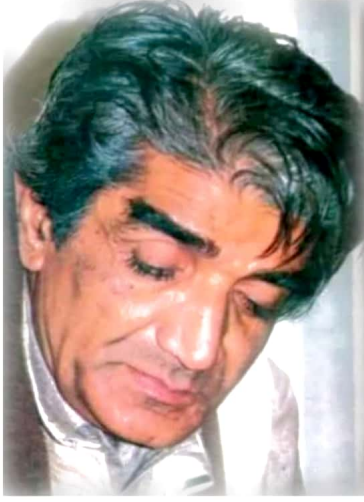
ماسٹر کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا، دیکھتے ہی دیکھتے وہ نیچے جھکا اور تیزی سے اینٹ اٹھالی۔ ایک ہڑبونگ سی مچی اور سب لوگ پیچھے ہٹ گئے۔ میں نے ایک جھٹکے سے اپنا ہاتھ چھڑا یا اور ماسٹر صاحب کے قریب پہنچ گیا۔ ماسٹر غضبناک نگاہوں سے مجھے گھورنے لگا۔ نہلا اور دیگر گاؤں والے چیخ چیخ کر مجھے پیچھے ہٹنے کا کہہ رہے تھے۔



میں نے ایک نظر گاؤں والوں پر ڈالی، پھر ماسٹر صاحب کے پاس آکر پوری عقیدت سے ان کے اینٹ والے ہاتھ پر بوسہ دیا اور بولا

”ماسٹر صاحب! جہالت کا سمندر دلیل کے پتھر سے پار نہیں ہوتا۔“۔۔۔ ماسٹر صاحب کے ہونٹ کپکپائے، اینٹ ہاتھوں سے چھوٹی، آنکھوں میں نمی سی تیر گئی۔





لوگوں کو معاف کر دینے کا راستہ  
پرندوں کے ساتھ محبت کا راستہ  
انسانوں کے ساتھ محبت کرنے کا راستہ  
محروم پسماندہ لوگوں کی مدد کرنے کا راستہ  
"یہ سب اللہ کے راستے ہیں"

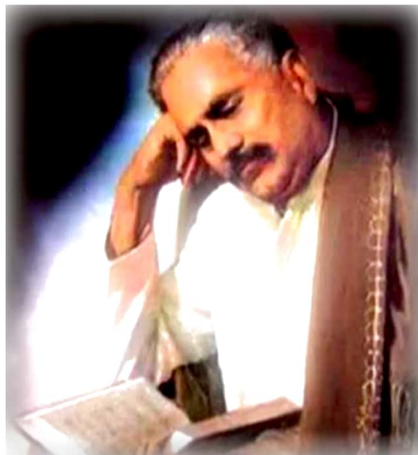
واصف علی واصف رحمۃ اللہ علیہ

بُختہ تر ہے گردشِ پیہم سے جامِ زندگی  
ہے یہی اے بے خبر رازِ دوامِ زندگی

(بانگ درا)

تشریح:

تشریح: مسلسل کوشش سے ہی زندگی پختہ ہوتی ہے اور زندگی نام ہے مسلسل کوشش کا جسے تڑپ اور جستجو ہی ہمیشہ کی زندگی عطا کرتی ہیں اور تگ و دو کرنے والا انسان زندہ و جاوید ہو جاتا ہے۔ زندگی کو غیر فانی بنانے کا یہی راز ہے۔



اگر حقیقت پر نظر ہو تو واضح ہو جائے گا کہ زندگی مشکلات کے سمندر سے گزر کر ہی پختگی کی منزل پر پہنچتی ہے اور اے بے خبر! زندگی کے ہمیشہ باقی رہنے کا راز یہی ہے۔

علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ



## الفلاح یوتھ فورم

### قیام کے مقاصد

- ★ مقدس اوراق کے لیے محفوظ جگہ فراہم کرنا
- ★ فقہی مسائل سے آگاہی
- ★ نوجوان نسل میں تعمیری اور فلاحی کاموں کے لیے شعور کی بیداری
- ★ نوجوانوں کو صلاحیتوں کے اظہار کے مواقع کی فراہمی
- ★ معاشرتی اور اخلاقی اقدار کا تحفظ
- ★ نوجوان نسل میں اتحاد اور ہم آہنگی کا فروغ
- ★ طلباء کے لیے اکیڈمیز کا قیام
- ★ کھیلوں کے مقابلوں کا انعقاد
- ★ عطیہ خون

ہم نے صرف سوچنے کا انداز بدلنا ہے، زندگیاں خود ہی بدل جائیں گی۔